بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمـــَنِ الرَّحِيمِ

AL QURAN

By

The Rev. Edward Canon Sell .D.D

اَلقرآنُ

من تصنیف

پادری کینن سیل صاحب ڈی ڈی

1919

Christian Literature Society
For India, Punjab Ludhiana

جس کو

کرسچن لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا پنجاب برانچ نے شائع کیا

اَلقرآن

۱۔ جے۔ ایم راڈویل صاحب ایم۔ اے نے عربی زبان سے قرآن کا ترجمہ کیا اور ۱۹۰۹ءمیں لندن میں شائع ہوا۔

۲۔ ڈاکٹر سیل صاحب نے قرآن کی تواریخی تکمیل تصنیف کو تیسری مرتبہ ۱۹۰۹ءمیں مدراس میں شائع ہوئی۔

۳۔ ینابیع الاسلام ۱۸۹۹ءمیں لاہور میں شائع ہوئی۔

۴۔ تفسیر بیضاوی (دو جلدوں میں) مرتبہ ایچ۔ اے صاحب ڈی ڈی ۱۸۴۸ءمیں لائب سک میں شائع ہوئی۔

سورہ بقرہ کی ۹۶ ویں آیت میں مرقوم ہے قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰه " یعنی توکہہ جو کوئی ہوگا دشمن جبرائیل کا سو اس نے اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔"

قرآن کا اس طرح نزول دائمی معجزہ قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری الہامی کتابوں کو کلام اللہ تو مانا ہے لیکن ان کی بابت یہ بات قرار دیتے ہیں کہ ان کے مضامین کا انسانی خیال میں القا کے وسیلے سے اظہار کیا گیا اور قرآن کا درجہ ان سے بہت ہی برتر و اعلیٰ و بالا ہے کیونکہ وہ لفظ بلفظ فرشتہ کی زبانی رسولِ عربی کو سنایا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ قیامت کی ۱۶ ویں سے ۱۹ ویں آیت تک یوں مندرج ہے لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ يعني" نہ چلا تو اسکے پڑھنے پر اپنی زبان کہ

شتاب اس کو سیکھ لے۔ وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو سمیٹ رکھنا اور پڑھنا۔ پھر جب ہم پڑھنے لگیں توساتھ رہ تو اس کے پڑھنے کے ۔ پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول بتانا۔"

بیضاوی لکھتا ہے کہ جبرائیل آکر آنحضرت کو قرآن پڑھ کر سناتے اور سکھاتے تھے تاکہ آنحضرت یہاں تک یاد کرلیں کہ بالکل ذہن نشین نہ ہوجائے۔ نزولِ قرآن کا ذریعہ بالکل خارجی تھا جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی ۱۱۲ ویں آیت مسطور ہے " أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" یعنی اتارا ہم نے قرآن عربی زبان کا۔"

ابن خلدون نزولِ قرآن کے باب میں لکھتا ہے کہ " قرآن آسمان سے عربی زبان میں اہلِ عرب کے محاورہ اور بول چال کے موافق نازل کیا گیا اور تھوڑا تھوڑا کرکے ایک ایک جملہ یا ایک ایک آیت حسبِ ضرورت پہنچایا گیا۔اس سے یا تو توحید ذات باری کی تعلیم دی گئی یا بنی آدم کے ان فرائض کا بیان کیا گیا جن کی بجاآوری اس دنیا میں لازم ہے۔" پس اس سے صاف عیاں ہے کہ نزولِ قرآن وحی کے وسیلے سے تھا۔ علمائے اسلام نے کلام اللہ کے نزول کی دوصورتیں مانی ہیں یعنی القا اور وحی ۔ القا کو الہام بھی کہتے ہیں۔ امام غزالی صاحب القا اور وحی کی تعریف یوں تحریر فرماتے ہیں۔(۱) القاوہ ہے جس میں نبی کو نادیدنی وسیلے سے آگاہی ملتی ہے۔ وہ دل میں ترغیب وتلقین محسوس کرتاہے لیکن کچھ دیکھتا سنتا نہیں۔ اس کو نفخ فی قلب بھی کہتے ہیں اور صوفیوں کو القا اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اس کانام الہام ہے۔(۲) وحی وہ ہے جس میں نبی دیدنی وسیلے سے آگاہی حاصل کرتاہے یعنی فرشتہ اس پر ظاہر ہوگا۔ یہ انبیاء[1] اللہ ہی سے مخصوص ہے۔" نزول قرآن اسی وسیلہ سے یعنی وحی سے مانا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا حرف حرف اور لفظ لفظ فرشتہ نے آکر سنایا اور سکھایا۔ قرآن وحی اور ازلیت کا مسئلہ راسخ الاعتقاد علمائے اسلام کو سخت مشکل میں ڈالتا ہے۔ جب وہ قرآن کو ازلی اور وحی کے وسیلے سے نازل دہ مانتے ہیں تو یہ دقتیں پیش آتی ہیں کہ قرآن کی بتدریج ترقی و تکمیل کا کیا سبب ہے؟ قرآن نے پرانے اور دیگر مذاہب کے قصص سے کیسے اخذ کیا؟ بعض آیات کے باہمی تناقض کا کیا سبب ہے؟ اور رسولِ عربی کی حسبِ موقعہ متغیر حکمتِ عملی اور بنی آدم سے متغیر سلوک کا کیا باعث ہے؟ آج کل تمام مذہبی کتابوں کی تحقیق اور چھان بین اعلیٰ تحقیق کے اصول کے مطابق کی جاتی ہے اوران کے حسن وقبح کو حتی الامکان خوب اچھی طرح سے پرکھا جاتا ہے۔ علمائے اسلام اب یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ قرآن اس تحقیق وتدقیق سے مستثنیٰ کیا جائیگا بلکہ ان کو چاہیے کہ اس تحقیق کا کوئی معقول طریقہ اختیار کریں اور آئندہ کبھی یہ خیال نہ کریں کہ ان کی دینی کتاب کی تحقیق اور محققانہ چھان بین کرنا اسکی توہین یا حقارت کرنا ہے۔ قرآن پر خواہ کسی پہلو سے نظر کریں تمام مشرقی علوم کے ماہر اس پر متفق ہیں کہ قرآن بڑی عظیم الشان کتاب ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی خوب بدرجہ غایت تحقیق کی جائے اس قسم کی تحقیق پر اعترض کرنا اندرونی عیوب اور کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔

یہ بحث کوئی نئی بحث نہیں ہے۔ صدہا سال گذر چکے ہیں کہ بڑے بڑے متبحر علمائے اسلام نے ازلیت قرآن پر اعتراض کئے اور محققانہ اس کی تحقیق کی۔ازلیتِ قرآن کی پوری تحقیق کے لئے نہایت ضروری ہے کہ پہلے اوصاف الہیٰ خصوصاً اس صفت کا جو کلام کہلاتی ہے بیان کیا جائے۔ کلام کا مفہوم محض بولنا ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے وسیلہ اظہار و تفہیم مافی الضمیر پر کلام کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی صاحب نے احیاعلوم الدین میں لکھا ہے " وہ اپنے ذاتی ازلی کلام کے وسیلے سے بولتا اور حکم کرتاہے۔ منع کرتا، وعدہ کرتا اور دھمکاتا ہے قرآن بیشک زبان سے پڑھا جاتا ہے ۔ کتابوں میں لکھا جاتاہے اور دل میں رکھا جاتاہے تو بھی چونکہ جوہرِ ذات خدا میں شامل ہے ۔ کاغذ پر لکھا جانے اور دلوں میں منتقل ہونے سے اس

[1] مذاق العارفین جلد سوم صفحہ ۲۱۴

ذاتِ پاک سے جدا نہیں ہوتا[1]۔ النصفی جو سن ہجری کی چھٹی صدی کے شروع میں تھا یوں لکھتا ہے " وہ جل جلالہ کلمہ (کلام) سے بولتا ہے۔ یہ کلمہ اس کی ذاتِ پاک کی ازلی صفت ہے۔قرآن خدا کا غیر مخلوق کلام ہے۔" اس مضمون پر اور بہت سے بڑے بڑے علمائے اسلام کے اقوال نقل کئے جاسکتے ہیں۔ وہ سب کے سب بالااتفاق قرآن کو خدا کا ازلی[2] کلام اور اس کے جوہر[3] ذات میں شامل مانتے ہیں۔

فرقہ معتزلہ کے لوگوں نے شروع ہی سے ازلیتِ قرآن کے خام خیال کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان کے اعتراضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔(۱) قرآن عربی زبان میں لکھا گیا۔ نازل ہوا ، لکھا اور پڑھا سنا جاتا ہے۔ قرآن معجزہ کا موضوع تھا۔ مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور بہت سی آیات ایک دوسری کو منسوخ کرتی ہیں۔(۲) واقعات مندرجہ قرآن صیغہ ماضی میں بیان کئے گئے ہیں لیکن اگر قرآن ازلی ہوتا تو بجائے ماضی کے صیغہ مستقبل استعمال کیا جاتا ۔(۳) قرآن میں بہت سے اومراو نواہی مندرج ہیں۔ اگر قرآن ازلی ہے تو یہ اومراو نواہی کس کے لئے تھے؟(۴) اگر قرآن ہمیشہ سے موجود ہے تو ضرور ہمیشہ تک موجود رہیگا اور نتیجتہً قیامت کے روز اور عالم بقا میں بھی بنی آدم پر ان تمام دینی فرائض کی بجاآوری واجب ولازم ٹھہریگی جنکو وہ اب بجالاتے ہیں اور شریعت کی پوری پابندی کرینگے۔(۵) اگر قرآن ازلی ہے تو وہ دو ازلی ہیں ۔(۶) بنی آدم قرآنی ترتیب وفصاحت کی تصنیف پر قادر ہیں۔ فرقہ معتزلہ نے نزولِ قرآن و القا سے منسوب کیا اور اس طرح سے قرآن دائرہ تحقیق وتدقیق کے اندر آگیا۔ متعزلہ مانتے تھے کہ قرآن خدا کی مرضی کا اظہار ہے جو الہیٰ ہدایت کے ماتحت رسولِ عربی کے

[1] دیکھو میکڈونالڈ صاحب کی کتاب مسمیٰ بہ مسلم تھیولاجی صفحہ ۳۰۰ سے ۳۰۷ تک جہاں احیائ علوم الدین کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ جو اس بات سے علاقہ رکھتا ہے۔

[2] ایضاً ترجمہ صفحہ ۳۰۹

[3] الکلام النفسی القدیم القائم بلاتہ

وسیلے سے ہوا۔ انہوں نے قرآن میں الہیٰ اور انسانی ہر دو پہلو محسوس کئے اور جو کچھ اس میں تغیر طلب یا جاتا رہنے والا تھا اسے انسانی جزو قرار دیا۔ اس لحاظ سے قرآن ازلی اور آسمان سے نازل شدہ نہیں ٹھہرتا۔قرآن کے بارہ میں فرقہ معتزلہ کی اس رائے سے سخت فساد برپا ہوگیا۔ اگرچہ خلیفہ المامون نے ۲۱۲ ہجری میں یہ فتویٰ جاری کیا کہ جو کوئی ازلیت قرآن کا متعقد ہو وہ ملحد وبدعتی ہے تو بھی ازلیت کے متعقد اپنے اعتقاد سے دست بردار نہ ہوئے اور نتیجتہً بہت سے قتل بھی کئے گئے۔ پھر انقلاب زمانہ سے وہ وقت آگیا کہ فرقہ معتزلہ پر سختی ہونے لگی لیکن انہوں نے بھی بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے اپنے ایمان واعتقاد پر جانیں قربان کیں۔ اب معتزلہ مفقود معدوم ہوگئے اور کلامِ خدا کے نزول کے معقول خیال کا موقعہ صدہا سال تک رفت وگزشت ہوگیا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ کچھ عرصے سے پھر فرقہ معتزلہ کے خیالات کتم عدم سے صفحہ وجود پر۔ اظہار پذیر ہورہے ہیں۔ سید[4] امیر علی نے صاف اپنے تئیں اسی فرقہ سے منسوب کیا ہے۔ فاضلِ اجل ومصنف بے بدل مولانا چراغ علی صاحب مرحوم نے بھی اپنے تیئں القا ووحی پر اپنے صاف وصریح بیانات کے وسیلے سے اسی فرقے سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ " نبی بے عیب وبے خطا نہیں ہے۔ نبی محسوس کرتا ہے کہ اس کا ذہن خدا نے روشن کردیا ہے اور اس الہیٰ تاثیر کے زیر اثر وہ جن خیالات کو تقریراً یا تحریراً ظاہر کرتا ہے وہ سب کلامِ خدا تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ تنویر ذہن یا الہیٰ تاثیر نبی کی قابلیت اور اس کے دینی اور اخلاقی حالات کے موافق ہوتی[5] ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ فرقہ معتزلہ نے ازلیت قرآن کی بحث میں کبھی ماخذ ہای قرآن کو پیش کیا ہے یا نہیں۔ انہوں نے اس بات پر بڑا زور دیا اور اسی پر قائم رہے کہ قرآن ازلی نہیں

[4] Personal Law of the Mohammedanism. (اہل اسلام کی شخصی شریعت صفحہ ۱۱)

[5] تحقیق جہاد صفحہ ۶۹۔

بلکہ مخلوق ہے۔اگر ان میں تحقیق کی کافی لیاقت ہوتی اور ماخذ ہائ قرآن کا کافی علم ہوتا تو ان کے دلائل وعقائد میں بڑی مضبوطی آجاتی ۔ زمانہ حال کا ایک مشہور عالم معتزلہ معترف ہے کہ قرآن نے ادیانِ پیشین سے بہت کچھ لے لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتاہے کہ " بہشت اور حوارانِ بہشت کی اصل زرتشتی دین سے ہے۔ دوزخ اور عذابِ دوزخ کا ماخذ طالمود ہے اور دینِ محمدی انتخابی دین[1] ہے۔

ماہران علومِ مشرق جنہوں نے ینابیع القرآن کی خوب تحقیق کی ہے۔ اب بالا اتفاق بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت نے اپنے ملک اوراپنے زمانے کے بہت سے افسانوں مثلاً یہودیوں کی احادیث وروایات اور عرب وسیریا کے مسیحیوں کے رائج افسانوں اور داستانوں کو قرآن میں داخل[2] کرلیا ہے۔آپ کے پہلے مکی مخالفین نے آپ کی باتیں سن کرکہا تھاأَسَاطِير[3] الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا " یعلمہ بشر" یعنی نقلیں ہیں پہلوں کی جو لکھ لیا ہے۔ سووہ وہی لکھوائی جاتی ہیں اس پاس صبح وشام ۔ اس کو تو سکھاتا ہے ایک آدمی[4] ہے۔

لیکن یہ سب آنحضرت کے مخالفوں کے بیانات ہیں جن پر زیادہ زور دینا ضروری ہے۔ مناسب معلوم ہوتاہے کہ قرآنی عبارات کا ان کے ماخذ ہائ پیشین سے مقابلہ کیا جائے۔ جو کچھ آنحضرت نے زرتشتی مذہب سے اخذ کیا اس کی فہرست میں آنحضرت کا معراج، اسلامی بہشت وحورانِ بہشت، نورِ محمدی اور الصراط شامل ہیں۔

معراج کا بیان سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں یوں مندرج ہے سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا یعنی "پاک ہے جو لے گیا اپنے بندے کو تو رات ادب والی مسجد سے پرلی مسجد تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں کہ دکھادیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے۔"

شبِ معراج میں آنحضرت نے جو کچھ سنا اور دیکھا اس کے بارے میں محدثین وشعرائ اسلام نے جس قدر روشن بیانیاں کی ہیں وہ سب کی سب یہ کہکر رد کی جاسکتی ہیں کہ اہلِ اسلام کے لئے ان کو ماننے کی کچھ ضرورت نہیں ۔ راسخ عقیدہ یہی قرار پایا ہے کہ شبِ معراج میں فی الحقیقت آنحضرت نے سفر کیا۔ لیکن سرسید احمد اور دیگر ذی ہوش اہلِ اسلام اس کو فقط ایک رویا مانتے ہیں۔ اہلِ اسلام کے اس باہمی تخالف سے کچھ بحث نہیں ۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ معراج کا خیال پیدا کہاں سے ہوا؟ بیشک اس کی بنیاد ارتاویراف کے معراج مندرجہ کتاب ارتاویراف پر ہے جو غالباً محمد صاحب سے چار سو سال پیشتر کی تصنیف ہے۔ اس میں اور معراج محمدی کے احادیثی بیان میں بہت بڑی مشابہت[5] ہے۔

مکی سورتوں میں بہشت اور حورانِ بہشت کا بیان بالکل حقیقی ومادی طور پر پیش کیا گیاہے۔ نئی روشن کے سمجھدار مسلمان اسے استعارہ اور کنایہ[6] کے پیرایہ میں سمجھتے ہیں ۔ بہشت وحورانِ بہشت کی بابت بھی آنحضرت کی تعلیم زرتشتی دین سے لی گئی ہے۔ اس پر سید امیر اعلی[7] صاحب کی شہادت پیش کرتے ہیں اور ہمارے خیال میں یہی شہادت کافی ہے۔ نورِ محمدی کا افسانہ بھی خوب مشہور ہے اور شیعہ لوگوں کا علی کے لئے اعلیٰ درجے کا دعویٰ کرنا اس سے بہت ہی قریبی رشتہ رکھتاہے۔ قرآن میں اس کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا۔ اگر کچھ ہو تو شاید سورہ توبہ ۵رکوع کی ۳۲آیت کے الفاظ میں کچھ اشارہ پایا جائے۔ اس آیت میں یوں

---

[1] سپرٹ آف اسلام صفحہ ۳۹۴و۳۸۷۔

[2] راڈویل کا قرآن صفحہ ۸

[3] سورہ فرقان رکوع ۱ آیت ٦

[4] بیضاوی لکھتاہے کہ اس آدمی سے مراد سلیمان فارسی ہے۔

[5] ارتاویراف کے مقبتسات ینابیع الاسلام کے ۱۹۲ سے ۱۹۴ صفحہ تک مندرج ہیں۔

[6] دیکھو کشف القرآن۔

[7] سپرٹ آف اسلام صفحہ ۳۹۴ ۔زیادہ صفائی کے لئے دیکھو ینابیع القرآن سورسز آف دی قرآن صفحہ ۲۳۵، ۲۳۷۔

مرقوم ہے يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُواْ نُورَ اللّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ "یعنی چاہتے ہیں کہ بجھا دیویں روشنی اللہ کی اپنے موہنوں سے" ۔ خلاصۃ التفاسیر میں لکھاہے کہ یہ آیت محمد کی روشنی اور دین احمدی کے ثبات ودوام کا ثبوت ہے لیکن نورِ محمدی کی طرف اس سے کچھ اشارہ ملتا ہے یا نہیں مشکوک امر ہے۔ تاہم راسخ العقیدت مسلمان اس نور کے وجود پر بہت[1] زور دیتے ہیں۔ اس کی اصل بھی زرتشتی دین میں ملتی ہے۔ مینوخرد اور خشیتہ میں نورِ جمشید کا بھی ایسا ہی بیان پہلوی زبان میں مندرج[2] ہے جو کہ اسلامی افسانے کی طرح پشت در پشت روایتہً رواج پاتا چلاآیا ہے۔

پھر الصراط یعنی دوزخ پر کے پُل کی بابت یوں لکھاہے ۔ وَلَوْ[3] نَشَاء لَطَمَسْنَا عَلَى أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ احْشُرُ[4]وا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ "یعنی اور اگرہم چاہیں مٹادیں ان کی آنکھیں۔ پھر دوڑیں راہ چلنے کو۔ جمع کرو گنہگاروں کو اوران کے جوڑوں کو اور جو کچھ پوجتے تھے اللہ کے سوا۔ پھر چلاؤ ان کوراہ پر دوزح کی۔"

قرآن میں صراط کا مفہوم پُل نہیں ہے لیکن امام غزالی صاحب فرماتے ہیں کہ " یہ دوزخ[5] پر ایک پُل ہے جو تلوار سے تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ کافروں کے پاؤں اس پر سے پھسلینگے اور وہ تقدیر الہیٰ کے موافق دوزخ میں گرینگے۔ لیکن مومنین کے پاؤں خدا کے فضل سے اس پر جم کر پڑینگے اوروہ پُل سے گذر کر جنت الفردوس میں پہنچینگے۔

[1] قصص الانبیا اور روضتہ الاحباب کوملاحظہ کیجئے۔
[2] اصل عبارت ینابیع الاسلام فصل نہم صفحہ ۱۰۷ سے آخر تک منقول ہے۔
[3] سورہ یسین ۴ر کوع آیت ٦٦
[4] سورہ صافات ۲ر کوع آیت ۲۲، ۲۳
[5] دیکھو احیائے علوم الدین۔

لفظ صراط فارسی قدیم کے لفظ چنوت سے ماخوذ ہے اور یہ خیال سراسر زرتشتی دین سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لفظ دین کرت سے منسوب ہے جہاں متکلم کہتاہے کہ وہ اس واسطے خدا کی پرستش کرتا ہے کہ دوزخ کے سخت عذاب سے بچ کر اور چنوت سے گذر کر مبارک مقام میں پہنچے[6]۔

اگرچہ محمد صاحب نے انجیل کا ذکر کیا اوراسے کلام اللہ مانا اور کہا کہ وہ یسوع (عیسیٰ) پر نازل ہوئی تھی اور قرآن پہلی کتابوں کا مصدق[7] ومحافظ ہے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو یہود ونصاریٰ کی کُتبِ مقدسہ سے بہت کم واقفیت تھی۔آنحضرت کے زمانے سے بہت عرصہ بعد بائبل کا عربی زبان میں ترجمہ[8] ہوا۔ جو کچھ آپ نے یہودی اور مسیحی دین کے بارے میں لکھا ہے وہ سب کا سب زیادہ ترجعلی اناجیل اور یہودی[9] احادیث سے لیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف کی ۸ ویں آیت سے ۲۵ویں آیت تک اصحابِ کہف کا افسانہ مندرج ہے۔ یعقوب سروگی جو ۵۲۱ ء میں مرگیا اس افسانہ کا کچھ ذکر کرتا ہے جوسات سونے والیوں کی کہانی کے نام سے مشہور تھا اور تواریخی لحاظ سے بالکل غیر معتبر ہے۔ محمد صاحب کی خطا اس افسانہ کو قبول کرنے میں ان سریع الاعتقاد مسیحیوں کی خطا سے بڑی نہیں ہے جنہوں نے اس کو بیانِ امرِ واقعی مان رکھا تھا لیکن اس بات کو ماننا نہایت مشکل ہے کہ یہ افسانہ ازل ہی سے لوح محفوظ پر مرقوم تھا جو جبرائیل کی معرفت نازل ہوا۔

پھر مریم طاہرہ کی تواریخ بھی قریباً سب کی سب جعلی اور غیر معتبر اناجیل سے لی گئی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت مریم کو موسیٰ وہارون کی بہن مریم سے تمیز

[6] ینابیع الاسلام اردو صفحہ ۱۱۵، ۱۱۸
[7] سورہ مائدہ ۷ رکوع آیت ۵۲۔
[8] راڈویل کا قرآن صفحہ ۱۱
[9] یہ کتابیں ۲۲۰ سے ۵۳۰ء تک تصنیف ہوچکیں تھیں اور عرب کے یہودی ان سے بخوبی واقف تھے۔

نہیں کرسکے ۔ چنانچہ قرآن میں مرقوم ہے يَا أُخْتَ[1] هَارُونَ مریم ابنت عمران[2] یعنی "اے ہارون کی بہن۔ مریم عمران کی بیٹی۔"

عمران عمرام کی عربی صورت ہے اور بائبل میں عمران موسیٰ وہارون اور ان کی بہن مریم کا باپ[3] بیان کیا گیاہے۔ مریم کی پیدائش کا بیان سورہ عمران ۴ر کوع ۳۸ویں اور ۳۹ ویں آیت میں مندرج ہے اوراس کی تفسیر میں " پروتیو[4] نجیلیم جیکو بائیٔ منارس" سے نقل کرتا ہے۔ پھر اسی سورۃ کی ۴۴ویں آیت میں مرقوم ہے ذَلِكَ مِنْ أَنبَاء الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُون أَقْلاَمَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ " یعنی یہ خبریں غیب کی ہیں۔ ہم بھیجتے ہیں تجھ کو اور تو نہ تھا ان کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون پالے مریم کو۔"

بیضاوی لکھتاہے کہ " اس آیت میں خاص کر اس کے الہامی ہونے پر زور دیا گیا ہے" لیکن الہامی ہونے پر زور دینا بالکل غیر ضروری اور بیفائدہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ افسانہ پہلے ہی خوب مشہور تھا۔

پروتیو نجیلیم میں لکھا ہے کہ" اس[5] (کاہن) نے ہر ایک کو اپنا عصا دیا اور عصا سے ایک کبوتر نکلا اوراڑ کر یوسف کے سر پر جا بیٹھا اور کاہن نے اس سے کہا کہ تونے قرعہ کے وسیلے سے خداوند سے اس کنواری کو پایاہے۔ تو اس کی اپنی حفاظت میں لیلے۔"

---

[1] سورہ مریم ۲رکوع کی ۲۸، ۲۹ویں آیت۔

[2] سورہ مریم ۲رکوع ۲۱ویں آیت

[3] گنتی کا ۲۶واں باب

[4] دیکھو کتاب مسمیٰ بہ کرستومادیا بیضاویانہ صفحہ ۲۶، ۵۹

[5] اصل یونانی عبارت ینابیع الاسلام اردو کے ۷۱ویں صفحہ پر مندرج ہے۔

سورہ مریم کے ۲ رکوع ۱۶ ویں آیت سے ۳۵ آیت تک یسوع مسیح کی پیدائش کا حال مرقوم ہے ۔ درختِ خرما کا افسانہ ایک غیر معتبر کتاب مسمیٰ بہ " تواریخ مریم وطفولیت مسیح" میں پایاجاتاہے۔

پھر سورہ مریم ۳رکوع اور سورہ عمران ۴ رکوع میں مسیح کا گہوارے میں سے کلام کرنے کا افسانہ بھی مندرج ہے۔ اس کی اصل " انجیلِ طفولیت " ہے اور آپ کی حرموں میں ایک مریم نامی بھی تھی جوآپ کی نہایت عزیز اور غالباً اس افسانہ سے بخوبی واقف تھی۔

سورہ مائدہ ۱۵ رکوع آیت ۱۰۹ و ۱۱۰ میں ایک اور افسانہ مرقوم ہے۔ لکھاہے کہ عیسیٰ (یسوع) مٹی سے پرندے بناتا تھا۔ اس افسانہ کی اصل ایک اسرائیلی مرد تھومانامی کی غیر معتبر انجیل[6] ہے ۔ پھر مائدہ کا مفروضہ معجزہ سورہ مائدہ ۱۵ رکوع ۱۱۲، ۱۱۵ آیات میں مندرج ہے چنانچہ اسی مفروضہ معجزے کے بیان کے سبب سے اس سورہ کا نام مائدہ رکھا گیا ہے یہ افسانہ ضرور حبشی اصل کا ہے کیونکہ قرآن میں مسیح کے شاگردوں کے حق میں لفظ حواریوں استعمال کیا گیا ہے جو کہ عربی لفظ نہیں بلکہ اہلِ حبش کی اصطلاح ہے ۔ ابتدائے اسلام میں بعض مسلمان عرب سے بھاگ کر حبش میں جا کرپناہ گزیں ہوئے تھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے وہیں یہ داستان سنی ہو اور اگر ایسا نہ ہوا ہو تو یہ عشائے[7] ربانی اور پطرس کی رویا[8] کا گڈمڈ بیان ہے۔

مسیح کے مصلوب ہونے کے بارے میں سورہ نساء ۲۲ رکوع کی ۱۵۶ ویں آیت میں یوں لکھا ہے کہ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَـكِن شُبِّهَ لَهُمْ "یعنی نہ اسکو مارا ہے نہ سولی پر چڑھایا لیکن وہی صورت بنگئی ان کے آگے۔"

---

[6] ینابیع الاسلام اردو صفحہ ۸۱، ۸۲

[7] لوقا ۲۰ : ۳۰۔

[8] اعمال الرسل ۱۰ : ۹ تا ۱۶

اگرچہ قرآن اپنے دعویٰ میں کُتب مقدُسہ کا مصدق ومحافظ ہے تو بھی یہاں بے دین لوگوں کے ملحدانہ خیالات اور رویہ کو اختیار کرتا[1] ہے۔آنحضرت مسیحی دین کی سچی تعلیم تثلیث فی التوحید سے بالکل ناآشنا وناواقف تھے اور سورہ مائدہ میں جو آپ نے اس تعلیم کا بیان کیاہے وہ مسیحی دین کے کسی عقیدہ میں بھی نہیں پایا جاتا۔

امام غزالی صاحب لکھتے ہیں کہ " ہر ایک[2] پکے مسلمان کو اس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ دو پلڑوں اور شاہین والے ترازو میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اعمال تولے جاوینگے" ۔ یہ وہی میزان ہے جس میں قیامت کے دن لوگوں کے نیک وبد اعمال کا وزن کیا جاویگا اور اس کے مطابق سزاوجزاملیگی۔ قرآن کی تعلیم اس مضمون پر بالکل صاف ہے ۔ چنانچہ سورہ مومنون ۶ رکوع آیت ۱۰۲ تا ۱۰۳ میں یوں مرقوم ہے :

فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُوْلَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ یعنی پس جن کی[3] بھاری ہوویں تولیں وہی لوگ کام کے نکلے اور جن کی ہلکی ہوویں تولیں سو وہی ہیں جو ہار بیٹھے اپنی جان۔ دوزخ میں رہا کرینگے۔"

اعمالِ انسانی کے وزن کرنیکا خیال نہایت قدیم مصری خیال ہے ۔ یہ بھی ایک غیر معتبر کتاب میں پایا جاتا ہے جو غالباً پہلے پہل مصر میں لکھی گئی تھی اوراس کا ایک عربی نسخہ بھی تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ قیامت کے روز ارواح انسانی ترازو میں تولے جاوینگے۔ پس نہایت صفائی اور صراحت سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ خیال کہاں سے لیا گیا ہے ۔ اس قسم کی اور بھی بہت سے سی مثالیں ہیں جو ینابیع الاسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوجاوینگی۔

قرآن کے جو حصے یہودی تواریخ سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد آنحضرت کے عہدِعتیق کے علم پر نہیں بلکہ ان کی سنی سنائی حکایات وداستانوں پر ہے جو آپ یہودیوں سے سنا کرتے تھے۔ انسانی پیدائش کے قرآنی بیان کے متعلق سورہ بقرہ میں مرقوم ہے کہ آدم نے خدا کے کہنے سے ہر ایک چیز کا نام رکھا۔ یہ بیان قرآن سے پیشتر ہی یہودی احادیث کی کتاب مسمیٰ بہ " مدارش رباہ" میں مندرج تھا[4] تھا۔

ابلیس کا آدم کے سامنے گر کر اسے سجدہ نہ کرنا قرآن کی بہت سی سورتوں[5] میں مذکور ہے۔ یہ امر نہایت قابل غور ہے کہ یہ تمام سورتیں باستثنائے ایک جو کہ غالباً مکی ہے آنحضرت کے ایام مدینہ کے وسطی[6] حصے کی ہیں جبکہ آپ مسیحیوں سے دوستی رکھتے تھے کیونکہ ربی گائگر کے بیان کے مطابق یہ افسانہ مسیحیوں سے لیا ہوا معلوم ہوتاہے اگرچہ اس کے بعد کی تصنیف ربی موسیٰ کی مدراش میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہ امر بہت ہی عجیب ہے کہ شیطان کے لئے جو نام استعمال کیا گیا ہے وہ عبرانی نہیں بلکہ وہی[7] ہے جو مسیحیوں نے استعمال کیاہے۔

اس میں شک نہیں کہ محمد صاحب کو یہودیت سے واقفیت حاصل کرنیکا کافی موقعہ تھالیکن آنحضرت نے اپنے معلومات کی تحصیل عبرانی کُتب مقُدسہ سے نہ کی بلکہ یہودی

---

[1] دیکھوراڈویل صاحب کا قرآن صفحہ ۲۴۷ حاشیہ دوم اور ینابیع الاسلام انگریزی صفحہ ۱۴۹ ، ۱۵۰ اردو صفحہ ۸۴۔ ۹ جہاں بسلیذ کے پھٹکر الفاظ پائے جاتےہیں۔

[2] احیاء علوم الدین

[3] دیکھو سورہ اعراف۔ سورہ القارعہ اور پورے بیان کے لئے " فیتھ آف اسلام "طبع سوم صفحہ ۲۵۸ اور ۲۵۹

[4] اصل عبرانی عبارت" جودازم اور اسلام" کے صفحہ ۶۷ پر نقل کی گئی ہے کہ ربی گایگر کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے Was hat mohammed aus judenthusme autyenommen

[5] سورہ حجر ۱۵ رکوع ۲۸ ، ۴۴۔ بنی اسرائیل ۱۷ رکوع ۶۳ ، ۶۵ ۔ کہف ۱۷ رکوع ۴۸ طٰہٰ ۷ رکوع ۱۱۵ ۔ ص ۵ رکوع ۱۷ ، ۸۶۔ اعراف ۷ رکوع ۱۰ ۔ تا ۱۸

[6] ۶۲۷ء سے ۶۱۹ء تک

[7] ابلیس (διαβολο) نہ کہ الشیطان (שגד)

احادیث اور مروجہ افسانوں سے جو کہ تواریخی لحاظ سے بالکل غیر معتبر اور ہیچ ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن میں عہدِ عتیق کے لوگوں کے حالات بالکل گڈ مڈ اور اغلاط سے بھرے پڑے ہیں۔ محمد صاحب نے بزرگانِ دین اور انبیائے سلف کو قرآن میں جس ترتیب سے بیان کیا ہے اور جس جس زمانے سے ان کو منسوب کیا ہے اس کے لحاظ سے ربی گائگر یہ صحیح نتیجہ نکالتا ہے کہ محمد صاحب نے کُتُب مقُدسہ یہود کو کبھی دیکھا ہی نہیں ۔ پھر آنحضرت کے مکی مخالفین نے کہا وَلَقَدْ[1] نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَـٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ،، وَقَالَ[2] الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَـٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ "یعنی اور ہم کومعلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو تو سکھاتا ہے آدمی[3] ۔ جس پر تعریض کرتے ہیں کہ اس کی زبان ہے اوپری اور یہ (قرآن) زبان عربی ہے صاف کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں یہ مگر جھوٹ باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے اس کا اس میں اور لوگوں[4] نے"۔ بہر حال اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قرآن میں جو کچھ مندرج ہے اسکے لئے جبرائیل کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ تمام بیانات بغیر جبرائیلی مدد کے بآسانی بہم پہنچ سکتے تھے۔ اس مضمون پرطویل بحث کا موقعہ نہیں ہے لہذا مختصراً چند باتیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

قابیل اور ہابیل کے بیان میں لکھاہے کہ خدانے ایک کوا بھیجا جس نے زمین کھود کر قابیل[5] کو بتایا کہ اپنے بھائی کے خون کو کس طرح سے چھپائے۔ یہ افسانہ بھی یہودی روایات سے لیا گیا ہے لیکن صحت سے نقل نہیں کیا گیا کیونکہ کوّے کا آدم کی طرف بھیجا جانا لکھاہے نہ کہ قابیل کے پاس[6] ۔

ہاروت وماروت کا عجیب قصہ جو سورہ بقرہ ۱۲ رکوع اور ۹۶ آیت میں مندرج ہے صریحاً ربیوں کے بیانات سے ماخوذ ہے۔ اس کی اصل عبرانی عبارت کو گائگر نے مع سندات لکھاہے۔ اسی طرح سے اور بہت سے مروجہ افسانوں کو حسب موقع اور حسب ضرورت قرآن میں داخل کرلیا گیا ہے۔ اگر یہ افسانے سچے ہیں تو ضرور جبرائیل نے محمد صاحب کی ولادت سے صدہا سال پیشتر دیگر معلمین بنی آدم کو پہنچائے ہونگے اور اس صورت میں اب ان کے تکرار کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ بہر کیف اب یہ تسلیم کرنا نہایت مشکل ہے کہ نزول قرآن وحی کے وسیلے سے ہے اور قرآن ازلی کتاب ہے۔

گائگر نے لکھاہے کہ جو یہودی عرب میں بودوباش کرتے تھے وہ باوجودیکہ عربی بول سکتے تھے تو بھی انہوں نے ربیوں کی عبرانی دینی اصطلاحات اور عبرانی ناموں کوقائم رکھا۔ پس جو الفاظ عربی اصل کے نہیں بلکہ عبرانی الاصل ہیں ان سے اس امر کا ثبوت ملتاہے کہ جن اسلامی اصطلاحات کا بیان ان کے وسیلے سے کیا جاتاہے وہ سب کی سب یہودی الاصل[7] ہیں۔ قرآن میں بہت سے عبرانی الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً، تابوت، توریت، جنتِ عدن، فردوس، جہنم ، احبار، درس، ربانی[8] ، سبت ، طاعوت، اور فرقان وغیرہ۔ فتحِ بدر کو یوم الفرقان لکھاہے۔ فرقان[9] روشن کرنے اور وحی بھیجنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ سورہ

---

[1]سورہ نحل ۱۴ رکوع ۱۰۵ ویں آیت۔

[2]سورہ فرقان ۱ رکوع ۵ویں آیت

[3]بیضاوی لکھتاہے کہ " اور لوگوں " سے یہودی مراد ہیں۔دیکھو جلد دوم صفحہ ۳۳۔

[4]مفسرین نے اس آدمی کے کئی نام پیش کئے ہیں ۔ گائگر کا خیال ہے کہ یہ عبداللہ بن سلام ایک ربی تھا جس کے ساتھ محمد صاحب متواتر دوستی رکھتے تھے۔

[5]سورہ مائدہ ۵ رکوع ۳۴ویں آیت۔

[6] دیکھو راڈویل صاحب کا قرآن صفحہ ۴۸۹ اور حاشیہ چہارم اور گائگر کا جودی ازم اور اسلام صفحہ ۸۰۔ گائگر کی جودی ازم اور اسلام صفحہ ۱۳۔

[7]سورہ عمران ۸ رکوع کی ۳۷ویں آیت اور مائدہ ۷ رکوع سے ۹ رکوع تک ۴۸، ۶۸ ویں آیات میں عزت و بزرگی کے نشان کے طور پر استعمال کیا گیاہے۔

[8]ان معنوں میں اس لفظ کا استعمال غلط ہے۔

[9]سورہ بقرہ ۳۴رکوع آیت ۲۵۷

انبیاء میں مرقوم ہے ۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً "یعنی اور ہم نے دی تھی موسیٰ کو اور ہارون کو چکوتی اور روشنی ۔" علاوہ بریں قرآن کا نام بھی فرقان ہے۔ پھر ایک اور لفظ مکینۃ ہے۔ سورہ بقر ۲۴۸ میں سموئیل بنی اسرائیل سے یوں کہتا ہوا پیش کیا گیا ہے "إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ یعنی نشان اس کی سلطنت کا یہ ہے کہ آوے تم کو صندوق جس میں دلجمعی ہے تمہارے رب کی طرف سے "۔

پھر یہی خیال مسلمانوں کے حق میں استعمال کیا گیا ہے اور سورہ توبہ میں لکھا ہے کہ ابوبکر جب غار میں تھا اس کو سکینۃ نصیب ہوئی اور سورہ فتح میں مرقوم ہے کہ حدیبہ میں آنحضرت سے وفاداری کا عہد کرنے والوں پر درخت کے نیچے سکینۃ نازل ہوئی ۔ یہ لفظ صرف مدنی سورتوں میں پایا جاتا ہے ۔ قرآنی عبارات کے بارے میں ایک لفظ" مثانی" استعمال ہوا ہے اور اس سے نہایت سخت پریشانی علمائے اسلام کو پیش آتی ہے۔ چنانچہ سورہ زمر آیت ۲۳ میں مرقوم ہے ۔" اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ یعنی اللہ نے اتاری بہتر بات کتاب آپس میں دہرائی ہوئی ۔"

ربی گائگر نے لکھا ہے کہ علمائے اسلام کی پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس لفظ کی اصل کو نہیں سمجھے۔

ربیوں کی تصانیف میں لفظ ملکوت حکومت خدا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ قرآن کے بھی کئی مقامات[1] میں پایا جاتا ہے ۔ نولدیکی بتاتا ہے کہ قرآن میں بہت سے غیر عربی الفاظ ہیں اور محمد صاحب نے ان کا غلط استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " فرقان" کے اصلی معنی خلاصی یا رہائی کے ہیں لیکن محمد صاحب نے عربی " فرق" سے مغالطہ کھا کر وحی

[1] سورہ انعام ۹ رکوع ۷۵ آیت۔ سورہ اعراف ۷ ۲ رکوع ۱۸۴ آیت۔ سورہ مومنین ۵ رکوع ۹۰ آیت۔ سورہ یسین ۶ ۳ رکوع ۸۳ آیت۔

کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ملہ کے اصلی اور درست معنی " لفظ" کے ہیں لیکن قرآن میں دین ومذہب کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔" عِلِّيُّونَ[2] صاف عبرانی لفظ ہے جو خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن محمد صاحب نے سورہ تطفیف میں غلطی سے" کتاب" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب کیا یہ بات قرین قیاس ہوسکتی ہے کہ یہ تمام غلطیاں جبرائیل سے منسوب کردی جائیں؟ لیکن نزولِ قرآن کے باب میں جب ہم جانتے ہیں کہ وسیلہ نزول وحی قرار دیا گیا ہے تو ان السنہ اجانبہ کے الفاظ کے غلط استعمال کا جوابدہ محمد نہیں بلکہ جبرائیل ہی ٹھہریگا۔

اگرچہ مان بھی لیا جائے کہ جو عبرانی الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں وہ عرب میں سکونت پذیر یہودیوں میں انہیں معانی میں مستعمل تھے جن میں قرآن میں استعمال کئے گئے ہیں تو بھی صاف ثابت ہوتا ہے کہ معتقدات یہود نے کیسے طور سے اسلام میں دخل پایا اور آنحضرت کو متعقدات یہود کے حصول کا کافی موقع تھا۔ پس اس صورت میں نزول قرآن کے لئے وحی کی ضرورت مطلق باقی نہیں رہتی ۔ اگر معتزلہ فرقے کے لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اسلام نے عربی بُت پرستوں ، یہودیوں اور مسیحیوں کے رسم ورواج اور معتقدات کو لے لیا ہے تو ان کی طرف سے اسلام وقرآن پر نہیں معلوم کیسے بڑے بڑے اعتراضات ہوتے اور کیا نتیجہ ہوتا۔ یقیناً وہ لوگ ازلتِ قرآن کا بالکل استیصال کردیتے۔ ان تمام مذکورہ بالا شواہد واقعات سے قرآن کا انسانی پہلو نظر آتا ہے اور اہل اسلام کے اس اعتقاد سے دست بردار ہوگئے ہیں لیکن بہت ہی تھوڑے ہیں جو مولوی چراغ لی مرحوم کی طرح یہ کہنے کی جرات کرسکتے ہیں کہ "مقلدین[3] کی راویوں اور خیالات کی کچھ پروا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ تقلید کی قید سے آزاد ہونا قرآن کے ٹھیک اور معقول مطالعہ کی طرف پہلا قدم ہے۔"

[2] سورہ تطفیف آیت ۱۸ ، ۱۹

[3] دیکھو مولوی چراغ علی کی کتاب مسمیٰ بہ For Under Moslem Rule

قرآن اور ترجمہائے قرآن پر نظر کرنے سے وحی قرآن کی تواریخی ترتیب کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ طویل صورتیں شروع میں اور چھوٹی آخری میں رکھدی گئی ہیں اوران کی تواریخی ترتیب کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔

راڈویل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن جس میں تمام سورتیں تواریخی ترتیب سے مرتب کی گئی ہیں مضامینِ قرآن کو خوب روشن کرتا ہے اوراس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ محمد صاحب کے دل ودماغ میں قرآنی خیالات وتدابیر کی کیسی بتدریج تکمیل ہوئی اور وحیِ آسمانی کیسے عجیب طور سے حسب موقع آنحضرت کی ضروریات کے مطابق پیغام ربانی لاتارہا۔[1]

قرآن کے یکبار نازل نہ ہونے پر مخالفین نے اعتراض کیا اورآنحضرت کا جواب بزبان وحیِ آسمانی سورہ فرقان کی ۳۴ویں آیت اور سورہ بنی اسرائیل کی ۱۰۷ ویں آیت میں یوں مندرج ہے ۔" وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا،،، وَقُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلاً یعنی کہنے لگے وہ لوگ جومنکر ہیں کیوں نہ اترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ اسی طرح ؟ تاثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل ؟ اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اور پڑھنے کا وظیفہ کیاہم نے اس کو بانٹ کرکے پڑھے تو اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر اور اس کو ہم نے اتارتے اتارا۔"

بیضاوی لکھتاہے کہ " ٹھہر ٹھہر کر" سے مراد ہے حسب موقعہ[2] اور حسب ضرورت۔ اگر راڈویل صاحب کے ترجمہ کے مطابق تواریخی ترتیب سے قرآن کا مطالعہ کیاجائے تو بیضاوی

[1] دیکھو نولدیکی کی کتاب Geschlchtedes Qurans and Sells' Historical Development of Qurán

[2] علیٰ حسب الحوادث ۔ جلد اول صفحہ ۵۵۳۔

کے قول کی پورے طور سے تصدیق ہوجاتی ہے۔ قرآن کے جن حصص پر بیضاوی کا " حسب الحوادث" یا حسب موقعہ وحسب ضرورت کا قول صادق آسکتا ہے وہ بہت سے ہیں مثلاًولید بن مغیرہ ۔ ابولہب ، اَخنس ابن شریف اور ابوجہل کو جووحیِ آسمانی کی ربانی[3] زجروتوبیخ کی گئی ہے وہ بالکل شخصی ہے اور بغض سے پر معلوم ہوتی ہے۔ جس قدر دشمنی بڑھتی اور سخت ہوتی گئی اسی قدر وحی آسمانی بھی سخت ہوتا گیا چنانچہ سورہ مراسلات کی ۱۵ آیت میں جوابتدائی مکی سورہ ہے (۱۰) مرتبہ لکھاہے وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ یعنی رسوائی ہے اس دن جھٹلانیوالوں کو "اہل مکہ ایمان لانے میں سست اور اعتراض کرنے میں بہت چست تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی آسمانی ان کے لئے پے درپے عذاب ودوزخ کے وعید سے پرُ پیغام لانے لگا۔ چنانچہ سورہ النبیاء اور سورہ المراسلت میں مرقوم ہے ۔"یعنی بیشک دوزخ ہے تاک میں ۔ شریروں کا ٹھکانا۔ جھٹلائیں ہماری آیتیں مکرا کر اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے ۔ لکھ کر ۔ اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائینگے تم پر مگرمار، چلو دیکھو جس چیز کو جھٹلاتے تھے چلو ایک چھاؤں کی جس کی تین پھا کیں ہیں۔ نہ گھن کی چھاؤں اور نہ کام آوے تپش میں۔"

پھر کچھ عرصے بعد آنحضرت نے ایامِ مکہ میں وحی کی زبانی عذاب دوزخ کا نہایت متوحش اور مفصل بیان سنانا شروع کیا۔ آنحضرت نے بیان فرمایا کہ آپ کے مخالف باہم زنجیروں میں جکڑے ہوئے جھلسانے والی ہو اور کھولتے پانی میں رکھے جاوینگے ۔ ان کا لباس رال کاہوا اور آگ میں لپٹے ہونگے ۔ ان کو وہاں کسی طرح کی ٹھنڈک نصیب نہیں ہوگی اوران کا کھانا پینا کھولتے پانی اور ہمیشہ بہتے ناسوروں سے ہوگا۔ آنحضرت کی ناراضگی وبرافروختگی کے اسباب بہت ہونگے لیکن سزائیں حد سے زیادہ سخت ہیں۔ بُت پرستی کے بارے میں لات وعزےٰ کا بیان کرتے وقت آپ نے غلطی کی اور پھر بہت جلد اس غلطی کی تصحیح بھی کرلی اور باستثنائے

[3] سورہ مدثر ۱ رکوع ۱۹ ، سورہ لہب وسورہ حمزہ ۱ ۔ ۷ آیت۔ سورہ علق ۱ رکوع ۶ ۔ ۷

معاملہ لات[1] وعزےٰ آنحضرت نے مکہ میں بتُ پرستی کے خلاف جو کچھ کہا اور کیا سب قابلِ تحسین وآفرین ہے۔

آنحضرت کی رسالت اور وحی کے باب میں جب مخالفین کی طرف سے شک اور اعتراضات پیش آئے توآپ کے منجانب اللہ ہونے کی تائید اور آپ کے پیغام کی تصدیق پر متواتر وحی کا نزول ہونے لگا[2] اور ساتھ ہی آپ کے مخالفین کی سخت سرزنش ہونے لگی۔ وحیِ آسمانی کا بہت سا حصہ اس مضمون پر پیش کیا گیا کہ انبیائے سلف کے ساتھ بھی انکی اقوام نے یہی سلوک کیا تھا جو آنحضرت سے اہلِ مکہ کررہے تھے۔ لہذا اہل مکہ کی مخالفت آنحضرت کی رسالت کی دلیل تھی۔ ہر روز کے واقعات مختلف تھے۔ مخالفت آئے دن نئی صورت اختیار کرتی تھی اور "حسب الحوادث" وحی بھی خوب حسب موقع وحسب ضرورت تمام امور میں آنحضرت کی یاوری کرتا تھا چنانچہ مکی سورتوں میں[3] قرآنی خدا کا اشتغال طبی سے برافروختہ وآشفتہ ہونا اظہر من الشمس ہے۔ ان ملامت آمیز سخت بیانوں ہی سے معلوم ہوسکتاہے کہ خود محمد صاحب کے دل میں بھی شکوک تھے۔ نبی اللہ کی سی متانت وعظمت آپ میں مطلق نظر نہیں آتی۔ اپنی مکی سکونت کے ابتدائی حصے میں آنحضرت نے مخالفین کو للکارا کہ اگر قرآن من جانب اللہ نہیں اور اختراعِ انسانی ہے تو تم بھی اسکی مانند بنالاؤ۔ چنانچہ سورۃ الطور کی آیت ۳۳، ۳۴ میں مرقوم ہے۔ أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ "یعنی کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ بات بنالایا ؟ کوئی نہیں پر ان کو یقین نہیں۔ پھر چاہیے لے آویں کوئی بات اس طرح کی اگر سچے ہیں۔

کہا جاتاہے کہ جن وانس سے کوئی بھی قرآن کے پایہ کی تصنیف پرقادر نہ تھا اور یہ دلیل ایسی مضبوط خیال کی گئی تھی کہ پھر دوبارہ مدینہ میں بھی پیش کی گئی۔ چنانچہ سورہ بقر کی ۲۱ویں آیت میں مرقوم ہے وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِه یعنی " اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا ہم اپنے اپنے بندے پر تولاؤ ایک سورت اس قسم کی ۔" نذیر ابن حارث نے یہ سن کر فارسی بادشاہوں کے چند قصے کہانیوں کو نظم کیا اور جیسی مجلسوں محمد صاحب قرآن پڑھا کرتے تھے پڑھ کر سنایا۔ نذیر ابن حارث کے لئے یہ فعل نہایت برُے نتائج کا باعث ہوا۔ سورہ لقمان کی آیت ٦ میں اس کے حق میں وحی آسمانی کا پیغام یوں مندرج ہے۔" وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ"یعنی اورایک لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تا بچلاویں اللہ کی راہ سے بن سمجھے اور ٹھہراویں اس کو ہنسی۔ وہ جو ہیں ان کو ذلت کی مار ہے۔"

نذیر[4] جنگ بدر میں اسیر ہوگیا۔ اس کا فدیہ نا منظور ہوا اور وہ قتل کیا گیا۔ لہذا اس پرمذکورہ بالاذلت کی مار پڑی۔ ایسے خطرناک مقابلہ کی بھلا کون جرات کرسکتا تھا؟ حق تو یہ ہے کہ قرآن کی مانند تصنیف کے ناممکن ہونے کے خیال میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیاہے اگر ممتنع المثال کا اشارہ نفسِ مضمون کی طرف ہے تو قریش کے لئے بیشک قرآن کی نظیر پیش کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ قرآنی تعلیمات کے معتقد نہ تھے اور اگروہ کوشش کرتے توجو کچھ وہ کرتے وہ قرآن کی نقل قرار پاتا اور نقل اصل کی وقعت سے ہمیشہ عاری ہوتی ہے۔ محمد صاحب نے

---

[1] دیکھو کشف القرآن طبع انگریزی صفحہ ۳۷

[2] سورہ حجر پہلار کوع ۱۰۔ سورہ ص پہلار کوع ۱۱ویں آیت۔ سورہ قمر ۳ر کوع ۳۴آیت۔ سورہ شعراء ۲ سے ۵ آیت تک سورہ انبیاء ۴ر کوع ۴۳ آیت۔ سورہ مومنین ۹ رکوع ۵۰ آیت۔

[3] سورہ التکویر ۱۵ - ۲۲ سورہ النجم ۵ آیت، سورہ الواقعہ ۳ر کوع ۴۷تا ۸۷۔ سورہ زخرف ۱ تا ۳۔ سورہ زمر ۳ر کوع ۴ ۲آیت۔ سورہ علق ۳ر کوع ۳۸تا ۴۴۔ سورہ الصاد ۳ر کوع ۲۵۔

[4] بیضاوی نے اسے نذیرابن حارث لکھاہے۔ جلد دوم صفحہ ۱۱۲ اور تفسیر حسینی جلد اول صفحہ ۱۸۳

قرآن پر اپنی شخصیت کی بھی چسپاں کر رکھا تھا اور جب تک کوئی ویسا ہی رسالت و نبوت کا مدعی نہ ہوتا قرآن کی مثال نہیں لاسکتا تھا لہذا لوگوں کے سامنے آنحضرت کا قرآن کو ممتنع المثال بیان کرنا اور پیش کرنا آسان تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کا طرز بیان یا قرآنی فصاحت ممتنع المثال ہے اور قرآن ہی کو فصاحت و بلاغت کا معیار ٹھہروایں اور دیگر کتُب کو قرآن سے مطابقت یا مخالفت کی بنا پر فصیح یا غیر فصیح قرار دین تو واجبی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام تحریرات و تصانیف جہاں تک قرآن سے مطابق ہونگی وہیں تک اچھی سمجھی جاوینگی اور قرآن سے مطابقت کرنا نقل قرار دیا جاویگا۔ معتزلہ فرقہ کے لوگ کہتے تھے کہ اگر خدا اجازت دیوے تو انسان قرآنی فصاحت و بالاغت کی تصنیف پر قادر ہے۔[1]

علمائے اسلام جو قرآن کے ممتنع التحریب ہونے کی تعلیم دیتے ہیں وہ سورہ ہود کی پہلی آیت کو اس امر کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہے "یعنی کتاب ہے کہ جانچ لی ہیں باتیں اس کی پھر کھولی گئی ہیں۔" لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ خلیفہ عثمان کے عہد میں عثمان اور اس کے دیگر ساتھیوں کے سامنے قرآن کو جمع کرتے وقت مختلف قسم وقرات کی آیات پیش کی گئی ہیں اور بسا اوقات مکی آیات کے مقابلہ میں دوسری رد کی گئیں اور اس سے ابتدای اسلام میں بہت کچھ جھگڑا بپا ہوا۔

بقول بیضاوی " علےٰ حسبِ الحوادث" یعنی حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت وحی کی مثال سورہ عمران میں جنگ اُحد کے بیان میں نہایت صفائی اور صراحت سے ملتی ہے۔ جنگ بدر میں مسلمان اہل مکہ پر بڑی نمایاں فتح حاصل کر چکے تھے اور وہ فتح الہیٰ مدد اور عنایت ایزدی[2] سے منسوب کی گئی تھی پھر جنگ احد میں مسلمانوں نے شکست کھائی اور ٹھیک نتیجہ یہ تھا کہ خدا نے ان کو ترک کردیا۔

[1] شہر ستانی الملل والنحل صفحہ ۱۳۹ اس کی نہایت عمدہ بحث (نولدیکی کی تواریخ مشرق میں ۳۲ سے ۳۷ صفحہ تک مندرج ہے۔

[2] سورہ انفال ۹ ویں، ۱۰ ویں اور ۱۷ ویں آیات۔

یہودیوں نے اسی دلیل پر کہا" کسی سچے نبی اور انبیائی شان کے حقدار نے یا اسکے ساتھیوں نے میدان جنگ میں اپنے دشمنوں سے شکست کھائی اور ایسا نقصان نہیں اٹھایا جیسا کہ محمد صاحب اور اس کے ساتھیوں نے" بیشک یہ دلیل کمزور تھی لیکن فتح بدر کے متعلق تائید آسمانی کے اس قدر مبالغہ آمیز بیان کئے گئے تھے کہ اب اس شکست کے لئے کوئی عذر ڈھونڈھنا بہت مشکل تھا۔ بڑا بھاری خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہونے کا امکان تھا چنانچہ اس نازک حالت پر نظر کرکے مصلحت اندیش ومدُ بروحی آسمانی نے شکست کا سبب بیان کردیا۔ سورہ عمران[3] اس جنگ کے حوالجات سے بھری پڑی ہے اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک موقع پر عین " علےٰ حسبِ الحوادث" وحی نازل ہوتا رہا اور پست ہمت ہارے ہوئے مسلمانوں کی دلجوئی اور ہمت افزائی کرتا رہا۔

"علےٰ حسبِ الحوادث" نزول قرآن کی نہایت عمدہ مثال باہمی دینی برُدباری اور برداشت کے معاملہ میں ملتی ہے۔ قرآن میں یہود و نصاریٰ سے دوستانہ ومعاندانہ دونوں طرح کے سلوک کی ہدایت کی آیات بآسانی مل سکتی ہیں۔ کسی ٹھیک نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ان کے شان نزول کے مطالعہ سے بآسانی معلوم ہوجاتا ہے کہ آنحضرت کی حکمت عملی کس طرح متغیر ہوتی رہی اور کیسے رخ بدلتا رہا۔ دینی برُباری کی تائید وہدایت میں ذیل دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ یعنی " زور نہیں دین کی بات میں[4]۔ " یعنی یوں[5] ہی ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہود ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین، جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر

[3] رکوع ۱۴، آیت ۱۳۴، رکوع ۱۴ آیت ۱۳۸، ۱۳۹ و ۱۴۰۔ رکوع ۱۵ آیت ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۹ و ۱۵۴، رکوع ۱۷ آیت ۱۶۰، ۱۶۳ اور ۱۶۵ ویں آیت۔

[4] سورہ بقرہ ۳۴ رکوع ۲۵۶ ویں آیت۔

[5] سورہ بقرہ ۸ رکوع ۶۱ ویں آیت۔

اور کام[1] کیا نیک تو ان کو ہے انکی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں۔"

یہ ابتدائی ایام کی مدنی آیات ہیں اور اس وقت سنائی گئی تھیں جبکہ یہودیوں سے دوستی رکھنا ملحوظ خاطر تھا۔ اگرچہ مفسرین بیضاوی کی طرح ظاہر داری بُردباری کی تعلیم پیش کرتے ہیں لیکن قرآن خود اس تعلیم کی تنسیخ کرتاہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت سورہ عمران کی ۸۴ویں آیت سے منسوخ ہوجاتی ہے۔ ۸۴ویں آیت میں یوں مرقوم ہے "یعنی جو کوئی چاہے سوائے اسلام کی حکم برداری کے اور دین۔ سو اس سے ہر گز قبول نہ ہوگا اوروہ آخرت میں خراب ہے۔"

اس آیت سے صاف فیصلہ ہوجاتاہے کہ اور" لا اکراہ فی الدین" کے بارے میں کہا جاتاہے کہ اس سے کوئی عام قاعدہ قائم نہیں ہوتا بلکہ اس میں محض دو خاص[2] شخصوں کی طرف اشارہ ہے۔ بیضاوی کہتاہے کہ "لا اکراہ فی الدین" کا جملہ سورہ توبہ کی ۷۴ویں آیت سے منسوخ ہوگیاہے۔ چنانچہ مرقوم ہے "یعنی اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تندُ خوئی کراُن پر۔"

لیکن بعد میں جب یہودیوں سے نا اتفاقی وناچاقی کی چاک کمال کو پہنچ گیا توآنحضرت کا ضمیر اس مضمون پر بالکل روشن ہوگیا اورآپ نے بالکل صاف اور قطعی فیصلہ کردیا۔ چنانچہ سورہ مائدہ ۵۶ویں آیت مرقوم ہے" اے ایمان والومت پکڑویہودو نصاریٰ کو رفیق۔"

---

[1] بیضاوی اپنی جلد اول صفحہ ۶۴ پر کہتاہے کہ اس کا مطلب یوں ہے" دخل فی الاسلام دخلاصادقا" یعنی صدق دل سے اسلام میں داخل ہونا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ بُردباری کا سلوک لفظ ان کے ساتھ ہے جو دیگر ادیان سے دست بردار ہو کر مشرف با اسلام ہوتے ہیں۔

[2] کشف القرآن انگریزی طبع سوم صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰

اس آیت کی تعلیم ۵۶ویں آیت اور ۵۳ویں آیتوں کی تعلیم کی متناقض ٹھہرتی ہے اور اس سے مفسرین اسلام کو بڑی مشکل پیش آتی ہے اگرچہ وہ اپنے تمام علم کا زور اسی بات میں خرچ کرتے ہیں کہ بُردباری کی تعلیم کو برطرف کریں[3] اور جبر وتشدد کا جھنڈا کھڑا رکھیں۔

یہود و نصاریٰ کے حق میں سورہ توبہ کی ۳۰ویں آیت میں یوں مرقوم ہے" یعنی مار[4] ڈالے ان کو اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔"

نہایت افسوس کی بات ہے کہ آنحضرت پہلے تو یہ کہہ سکتے تھے "یعنی جھگڑا[5] نہ کرو کتاب والوں سے مگر اس طرح سے جو بہتر ہو۔" لیکن عمر رسیدہ ہو کر ایسا جنگ وجدل کا حکم دیگر کشت وخون کی تعلیم مسلمانوں کے ورثہ میں چھوڑ گئے۔ خوشی کی بات ہے کہ حد سے زیادہ مجذوب ومتعصب اقوام کے سوا باقی مسلمان اس تعلیم پر عمل نہیں کرتے لیکن یہ تعلیم تو ہمیشہ کے لئے قرآن میں مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوتاہے کہ بیضاوی کے قول کے موافق نزولِ قرآن کو" علے حسبِ الحوادث" جان کر تواریخی ترتیب کے مطابق پڑھنا بہت ضروری ہے۔" تواریخی ترتیب سے پڑھنے کی ضرورت کی توضیح کے لئے اور بھی بہت سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ راڈویل صاحب[6] لکھتے ہیں کہ قرآن نے ذاتِ باری کی تصورات کو اس کے علم وقدرت اور عالمگیر ربوبیت ووحدت کی صفات سمیت نہایت اعلیٰ صورت میں پیش کیاہے اورکمال خوبی سے زمین وآسماں کا واحد خدا ماناہے اوران امور کے لئے قرآن نہایت اعلیٰ درجہ کی تحسین وآفرین کا حقدار ہے۔ اس میں تو راڈویل صاحب سے سب کو اتفاق ہوگا لیکن ایک اور نہایت معتبر عالم کا قول ہے کہ محمد صاحب کا

---

[3] کشف القرآن طبع انگریزی صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴۔

[4] بیضاوی کہتاہے" یہ یہودو نصاریٰ کی بربادی وہلاکت کے لئے بدُدعا ہے یا ان کے قول کے عجیب ہونے پر تعجب ہے۔" ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھاہے" خدا ان کو برباد کرے۔" دیگر مفسرین بھی یہی ترجمہ کرتے ہیں۔

[5] سورہ عنکبو ۴۵ویں آیت۔

[6] راڈویل صاحب کا قرآن صفحہ ۱۵

قرآنی تصورِ خدا حد سے زیادہ موحوانہ ہے۔ خدادِ خلق خدا میں ازل ہی سے باہمی تخالف وجدائی قائم کرتاہے[1]۔

امام غزالی صاحب نے قرآنی تصورِخدا کی تعریف میں یوں تحریر فرمایاہے کہ وہ[2] حی قدیر، حاکم وفتاح ہے، وہ تمام دیدنی نادیدنی کائنات اور قدرت وقوة کا خداوند ہے۔ تمام حکومت اور فتح ونصر اور کلُ کائنات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ قرآن بنی آدم کو زیادہ ترخدا کی سات صفات یعنی حی، علیم، منشی، قدیر، سمیع، بصیر اور کلیم تعلیم دیتا ہے۔ پاکیزگی اور محبت صفاتِ مذکورہ بالامیں شامل نہیں ہیں ۔کہتے ہیں کہ یہ ہردو صفت ارادہ میں مرکوز ہیں لیکن اس سے اور بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ قرآنی تصور خدازیادہ ترایک جابروقادر اور مطلق[3] العنان ہستی کاہے۔ تنزیہ[4] کی تعلیم میں اس قدر مبالغہ کیا گیا کہ اس سے خدا کی ذات میں عیوب قائم ہوجاتے ہیں۔ قرآن میں خدا کے جسم کا خیال پایا جاتاہے اورعلمایِ اسلام کو تنزیہ[5] کے ساتھ اس خیال کوقائم رکھنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

[1] حوری کی کتاب مسمیٰ بہ اسلام ان سائنم این فلوس صفحہ ۱۴۴

[2] دیکھو احیایِ علوم الدین منقولہ سیکڈ انلڈ الہیات اسلام صفحہ ۳۰۲

[3] سورہ انعام آیات ۴۵ اور ۱۴۹ ۔ سورہ انسان آیات ۳۰ اور ۳۱

[4] اس تعلیم کے لحاظ سے خدا تمام کائنات اور محدود اشیاسے بالکل جدا اور بے واسطہ اور مطلق النعان ہے۔

[5] دیکھو فیتھ آف اسلام طبع سوم صفحات ۱۹۳ سے ۱۹۸ تک۔

خدا کے بارے میں قرآن کے بہت سے بیانات کی خوبی کو ہم بخوبی محسوس کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی کہتے ہیں (جیسا کہ حال ہی میں ایک مسلمان مصنف نے لکھاہے[6]) کہ ہمارے خیال میں جو تعلیم قرآن میں خدا کی ذات کے بارے میں پائی جاتی ہے وہ معقول اور صاف نہیں ہے۔ اس زمانے کی عربی اخلاق وحالات کے لحاظ سے مذکورہ بالامسلمان[7] مصنف کے بیان کے مطابق بیشک قرآن نے بُت پرستی اور چند دیگر قباحتوں کی تردید سے بڑا کام کیالیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی بہت سی قباحتوں کوروا اور روائج رکھا۔ اگرچہ خانگی جائداد میں کسی حد تک عورتوں کو بعض حقوق دئے تو بھی ان کو ذلیل وپست بنادیا اور خانگی وتمدنی امور کو بے قیاس ناگفتہ بہ برائیوں سے بھردیا۔

یہ بھی کہاجاتاہے کہ قرآن میں اسلام کے قوانین تمدن واخلاق امور سیاست وتجارت اور دیوانی وفوجداری غرض ہر طرح کےقوانین موجود ہیں اور تمام ادیان کی سچائی اس میں مجتمع ہے اور کسی طرح کے تناقص و[8] تبائین کو اس میں دخل نہیں لیکن یہ فصحیان اسلام کی محض خوش بیانیاں ہیں کیونکہ مولوی چراغ علی صاحب نہایت مشہور عالم یوں لکھتے ہیں[9] کہ "

[6] انڈین انٹر پرپٹر جلد دوم نمبر ۲ صفحہ ۹۷ ۔ اس کے علاوہ کیرو میں اوری ینٹل اور او کسی ڈینٹ مطبوعہ ۲۲، ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ ء میں قرآنی تصور خدا پر نہایت دلچسپ بحث شائع ہوئی ہے۔ مشہور فیلوسف ہیگل کہتا ہے کہ " اگرہم خدا کو محض ایک واجب الوجود ہستی مانیں اور بس تووہ ہمارے لئے محض ایک ایسی قوت ہوگا جس کا ہم مقابلہ نہیں کرسکتے یا مطلق العنان حاکم قرار پائیگا۔ اس میں شک میں نہیں کہ خداوند کا خوف دانائی کا شروع ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محض شروع ہی ہے۔ اہلِ یہود اوراہلِ اسلام نے خدا کو مطلق العنان حاکم ہی تصور کیاہے اور بس۔ اگرچہ خدا کا ایسا تصور بہت ضروری ہے تو بھی مسیحی تصورِ خدا کی گہرائی تک نہیں پہنچتا (ہیگلس ورکس جلد ششم صفحہ ۲۲۶، ۳۴۸) چنانچہ ڈاکٹر کویلی صاحب لکھتے ہیں " اس بڑے فیلوسف (ہیگل) کے خیال کے مطابق محمد صاحب نہ صرف عرفانِ الہیٰ میں ترقی کرنے میں قاصر رہے بلکہ تصورِ خدا میں مسیحیوں سے کہیں نیچے جاگرے اور انکا تصورِ خدا مدتوں کا ادنیٰ یہودیت اور محض الوہیت کا تصور قرار پایا۔"

[7] انڈین انٹر پریٹر جلد دوم نمبر ۲ صفحہ ۸۵۔

[8] انڈین انٹر پریٹر جلد دوم نمبر ۲ صفحہ ۸۷

[9] دیکھو چراغ علی کی کتاب ریفارمس انڈر موزلم رول صفحہ ۱۷ ۔

قرآن کو امور سیاست اور قوانین ملکی وتمدنی سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اگر وہ قوانین جو ساتویں صدی کے اہل عرب کے لئے وضع کئے گئے تھے تمام اہلِ اسلام کے لئے دائمی قرار دئے جاویں تو ہر طرح کی ترقی کی راہیں مسدود ہوجاوینگی۔"

قرآن کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ متناقض ومتبائین تعلیمات سے بالکل خالی ہے صحیح نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ اگر قرآن میں کی تعلیمات متناقض ومتبائن نہ ہوتیں تو محمد صاحب کی حکمت ہمیشہ متغیر ومتبدل نہ ہوتی اوراس وقت کی اقوام زمانہ سے آنحضرت کا سلوک آئے دن نئی صورت اختیار نہ کرتا۔ ناسخ ومنسوخ کی تعلیم قرآن کے حق میں اس قسم کے حُسن ظن پر مبنی وعاوی کی فوراً تردید کردیتی ہے کیونکہ ازروئِ تعلیم ناسخ منسوخ ایک آیت دوسری کومنسوخ کرسکتی ہے اور صریحاً تناقض وتبائن کادخل ہوجاتاہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ۱۰۵ ویں آیت میں مرقوم ہے "یعنی جوموقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلادیتے ہیں تو پہنچاتنے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"؟ قرآن میں تناقض وتبائن بکثرت موجود تھا اور یہ آیت اس پر پردہ ڈالنے اوراس کے سبب سے پیش آمدہ مشکلات کو دو کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی۔

پھر مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام سچا دین ہے اور عبادت الہیٰ میں کمال آزادگی ہے۔ کوئی جہاں چاہے اورجس طرف منہ کرکے عبادت کرنا چاہے کرے۔ خدا ہر جگہ اور ہر طرف موجود ہے۔ قرآن کی جس آیت کی بنا پر یہ کہا جاتاہے کہ اس کی تعلیم بہت اچھی ہے لیکن " علے حسب الحوادث" آنحضرت کی ضروریات نے اس آیت کو منسوخ کرڈالا اوراس کی ناسخ پر معل ہونے لگا کیونکہ سورہ بقر میں مرقوم ہے کہ " یعنی تو منہ کرطرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرومنہ کرواسی کی طرف۔"

علاوہ بریں یہ بھی دعویٰ کیا جاتاہے کہ قرآن میں یتیموں اور مسکینوں کے لئے نہایت عمدہ تعلیم پائی جاتی ہے۔ بیشک یہ بہت ٹھیک ہے لیکن بیوی کو مارنا[1] پیٹنا اور شخصی دشمنوں سے بغض وکینہ رکھنا اور ان کو نقصان پہنچانے کی گھات میں لگے رہنا بھی قرآن ہی میں ہے۔ یہودیوں کو ایذا دینا بھی قرآن میں ہی مرقوم ہے۔ اکثر یہ عذر پیش کیا جاتاہے کہ عہد عتیق میں بھی تو بہت سے بیرحمی کے کاموں کا ذکر پایاجاتا ہے ۔لیکن عہدِ عتیق کے بیرحمی کے کام مسیحی کلیسیا کے لئے نمونہ نہیں ہیں۔ ان بیرحمی کے کاموں کو ہم سنت اللہ تسلیم کرکے واجب التقلید نہیں مانتے ۔اگر محمد صاحب مسیح سے بجائِ ۶۰۰ برس کے بعد ۶۰۰ برس پیشتر اس قسم کی تعلیم دیتے تو عہد عتیق کی تقلید ان کے لئے کسی حد تک عذر ٹھہرتی لیکن جب یہودیت مسیحیت میں تبدیل ہوگئی اور مسیحیت نے عالمگیر اور دائمی دین کا رتبہ حاصل کرلیا اس وقت گذشتہ زمانہ کے شاہانِ یہود کے حوالجات پیش کرکے اپنی بیرحمی کے لئے عذر ڈھونڈنا رسالت محمدی کے اندرونی وحقیقی ضعف پر دلالت کرتاہے۔ یاہو[2] نے اخی اب کے گھرانے کی بیخ کنی کی اوراس میں ایسی ہی بیرحمی تھی جیسی کہ محمد صاحب نے یہودیوں کو قتل کرنے میں دکھائی۔ یاہو کی بیرحمی ہوسیع نبی کی کتاب کے پہلے باب کی چوتھی آیت سے صاف مذموم ثابت ہوتی ہے اور واجب الانتقام قرار دیجاتی ہے۔ جہاں تک ہم کومعلوم ہے مفسرین اسلام میں سے کسی نے بھی بنی قریضہ کے قتل کئے جانے کومذموم قرار نہیں دیا۔ بنی اسرائیل کی لڑائیوں سے یہ غرض تھی کہ بد کار اقوام کو مکافات ملے اور بنی اسرائیل اس وقت کی حالت کے موافق فرمانبرداری سیکھیں زبوروں میں جو مخالفین کے لئے سخت لعنت وملامت ہے اس سے راستی وناراستی کے باہمی تخالف کی توضیح مراد ہوسکتی ہے لیکن جہاں تک شخصی دشمنوں سے انتقام لینے کی روح کا اظہار ہو وہیں تک مصنف کے اخلاقِ مذمومہ پر دلالت

[1] سورۃ النسا ۶ رکوع ۳۸ آیت

[2] ۲ سلاطین ۱۰، ۳۰۔

ہو گی۔جو لوگ سنتِ نبوی کو فرض وواجب الادا سمجھتے ہیں اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن ازلی ہے اور ازل ہی سے لوحِ محفوظ پر مرقوم تھا اور وہاں سے بقولِ بیضاوی" علےٰ حسب الحوادث" حسب موقع اور حسب ضرورت نازل ہوا وہ ہر گز ہر گز بیرحمی وزمانہ سازی کے افعال کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے جس سے مسیحی دیکھتے ہیں۔ چنانچہ معتزلہ کہتے تھے کہ جو کچھ ازلی ہے وہ ہمیشہ تک ازلی وابدی رہیگا۔ بیشک بعض اوقات لوگ اپنے عقائد ومتعقدات سے بہتر ہوتے ہیں اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ امر واقعی ہے کیونکہ اسی حقیقت سے امید ہو سکتی ہے کہ اسلامی عقائد کی ترمیم اور اسلام کی ترقی دائرہ امکان میں آسکتے ہیں۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ مصنفین اسلام اکثر مشرقی علوم کے ماہر علمایِ مغرب کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تصانیف سے سہارا ڈھونڈتے ہیں جو باوجود بڑے ہوشیار وانشا پرداز ومورخین ہونے کے بھی مشرقی معاملات سے بالکل ناآشنا ہیں۔ چنانچہ اکثر مسلمان مسٹر باسورتھ سمتھ نے ۱۸۷۴ء میں محمد اور دین محمدی پر اپنے لیکچر شائع کئے اور ان میں آنحضرت کی اور آنحضرت کے افعال کی بڑی تعریف کی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسٹر باسورتھ سمتھ کا علم بڑھتا گیا اور دسمبر ۱۸۸۷ء میں اس نے لکھا" اب میں سوچتا ہوں کہ میرے سابق خیالات میں تبدیلی نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم خدا پر ایمان لاسکتے ہیں تو ہمیں اس بات پر بھی ایمان لازم ہے کہ مسیحی دین کی تکوک نہیں بلکہ بالکل یقینی ہے اور وقت مناسب پر ثابت ہوجاویگا کہ مسیح ازلی وابدی ہے اور اس کا دین کسی خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام جہان کا دین ہے" مسٹر باسورتھ سمتھ ماہر ان علوم مشرق میں سے نہ تھا اور اس لے اسے محقق اسلام کا رتبہ مل نہیں سکتا لیکن اہل اسلام اسے بڑا محقق خیال کرکے اکثر اپنی باتوں کی تائید میں اسکی باتوں کو پیش کرتے ہیں لیکن اب مناسب ہے کہ اگر اس کے اقوال کو پیش کرنا ہو تو اس کے پختہ خیالات کے اظہار یعنی بعد کے اقوال کو پیش کرنا چاہیے۔ اسی طرح سے کارلائل کو پیش کرتے ہیں لیکن اسلامی معاملات میں اس کی باتیں قابل اعتماد نہیں ہیں اسلام وقرآن کے بارے میں مطابقت اور مخالفت میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب ماہر ان علومِ مشرق کے نزدیک غیر معتبر اور بے حقیقت ہے۔ لیکن اگر اہل اسلام جیسا کہ ان کا خیال ہے کہ کارلائل کے بیانات کو موید اسلام پاتے ہیں تو ذرا دیکھیں کہ وہ قرآن کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ بات خیال میں نہیں آسکتی اور انسان کیونکر مان سکتا ہے کہ قرآن آسمان پر لوح پر لوحِ محفوظ پر ہے کیا زمین اس کی شان کے شایان نہ تھی۔ اگر قرآن کو اچھی سے طرح پڑھیں یا محض کتاب کے خیال سے دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک بالکل بے ربط اور اس قدر بے ترتیب ہے کہ شاید ہی کبھی کوئی کتاب ایسی بُری طرح سے لکھی گئی ہو گی [1]۔ اگر ہم اہلِ اسلام کو ایسے اشخاص کی تصانیف میں پناہ لینے کے فعل عبث پر کتنواہ اندیش کہیں یا خیال کریں تو انہیں متعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان کا ایسا کرنا ان کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال مناسب ہے کہ اہلِ اسلام آئندہ کو کارلائل کا ہر گز حوالہ نہ دیں گے۔ جو کتاب کروڑوں بنی آدم سے تعظیم وتکریم کا مطالبہ کرے جیسا کہ قرآن کرتا ہے وہ ہر گز ہر گز اس لائق نہیں کہ کارلائل جیسے آدمی کی متکبرانہ رائے کے سپرد کی جائے لیکن اگر محققانہ طور سے اس کی تحقیق وتدقیق کی جائے تو اس میں کسی طرح کی بے عزتی اور بے حرمتی نہیں ہے۔ ایسی کتاب کے مآخذ کی تحقیق ازحد ضروری ہے۔ اس زمانہ میں زمانہ سلف کی ہر ایک تصنیف جب تک تحقیق اور چھان بین سے نہ گذر لے کسی خاص مضمون یا زمانہ مستند طور پر منسوب نہیں کی جاسکتی اور اس کی تواریخی واخلاقی حیثیت قابلِ اعتماد نہیں ٹھہر سکتیں۔

---

[1] کارلائل ہیروز، ہیرو شپ۔ مطبوعہ ۱۸۴۰ء صفحہ ۷۷